دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کا
سب سے پہلا نصاب تعلیم
اس کی معنویت و جامعیت اور دوررس نتائج وثمرات

نورالحسن راشد کاندھلوی

[مرتب احوال وآثار کا یہ مضمون جو مؤقر مجلہ ماہ نامہ الفرقان لکھنؤ کے جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ جولائی ۲۰۰۷ء کے شمارہ میں چھپا تھا، چند تصحیحات وترمیمات کے بعد، احوال وآثار میں بھی شائع کیا جارہا ہے۔]

برصغیر ہند کے مدارس کا نصاب تعلیم، ایک ہمہ وقت زندہ وتازہ موضوع ہے، جس پر تقریباً ایک سو سال سے بحث وگفتگو جاری ہے، اس کے اچھے برے تمام پہلوؤں کا خاصا وسیع اور گہرا تذکرہ وتجزیہ ہو چکا ہے مگر کیا اس بحث وگفتگو سے اس کی نافعیت اور مردم آفرینی کا جوہر کم ہوا، یا اس کی تنقیح اور تحقیق مزید سے اس کو مفید ومؤثر بنانے کی کوئی تدبیر مثمر وبارآور ہوئی، دونوں کا ایک ہی جواب ہے.............نہیں!

اگر یہ جواب صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہمارا یہ نصاب تعلیم اب ویسے ذی علم، فہیم اور صاحب فضل وکمال افراد تیار نہیں کررہا جن کی ملت اسلامیہ کو ہمیشہ ضرورت رہی اور ہمیشہ رہے گی۔ اگر یہ نصاب ناقص تھا تو اس سے ایسے ایسے اعلیٰ ترین اور نمونہ فضل وکمال اصحاب کس طرح پیدا ہوئے، اب اس کا وہ اندرونی جوہر اور مردم گری کا ہنر کہاں چلا گیا، کہ اب اس نصاب تعلیم سے نہ دیوانے وجود میں آرہے ہیں نہ فرزانے! اس کی وجہ کیا ہے، اس کے اسباب کیا ہیں؟

دیانت داری اور گہرائی سے سوچیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زوال وبگاڑ کی وجہ دراصل وہ علاج ہے جسے غلطی سے ذریعہ شفا سمجھا جارہا ہے، جب تک یہ نصاب بڑی حد تک اپنی اس اصل صورت وکیفیت میں رہا، جس کو ہمارے بڑے اسلامی مدارس (دارالعلوم اور مظاہر علوم سہارنپور) نے اپنے تعلیمی سفر کے آغاز کے موقع پر مرتب اور نافذ کیا تھا، تو اس کے نتائج نہایت غیر معمولی اور شاندار رہے، اس سے ایسے ایسے افراد وجود میں آئے کہ دنیائے علم کی آب وتاب میں اضافہ ہوگیا اور جب تک تعلیم کے اس منہج اور اس کی خاص طرح کی جامعیت کا خیال رکھا گیا، اس کے دامن سے ملک وملت کو تروتازہ نئے نئے پھول اور عمدہ تحفے ہاتھ

آتے رہے اور جیسے ہی اس نصاب تعلیم میں تراش خراش کا عمل شروع ہوا، بعض چیزوں کو فضول اور زائد بلکہ خلاف تقشف ودین سمجھ کر نکال دیا گیا اور اس نصاب ومعمول میں، جو ہزار ہا علماء کرام اور مدرسین عظام کی نسبتوں اور دیدہ ریزی کا مرقع اور صدیوں کے تجربات کا نچوڑ تھا، تبدیلی شروع کی گئی تو یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ ہر اک تبدیلی کے ساتھ، اس کی صلاحیت مردم آفرینی کی لیاقت میں کمی آتی گئی اور:

''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''

اس لئے ضرورت ہے کہ ہم ایک مرتبہ پھر اصل کی طرف رجوع کریں، ان مدارس کے سب سے پہلے نصاب تعلیم کا ایک مرتبہ پھر اعادہ اور تجدید کریں، اپنے موجودہ نصابات اور اس قدیم نصاب تعلیم کی افادیت کا ایک مرتبہ اور جائزہ لیں مکرر تجربہ کریں کیوں کہ یہ فراموش کیا گیا نصاب تعلیم جوان مرکزی علمی اداروں میں، ان کے آغاز کے پہلے سال سے جاری کیا گیا تھا، حیرت انگیز حد تک ایسے مضامین وخصوصیات کا جامع ہے، جن کا عصر حاضر کے مسائل کے پس منظر میں مطالبہ اور تذکرہ کیا جاتا ہے۔

یہ نصاب جوان مدارس میں نافذ کیا گیا تھا اور جو موجودہ نصاب ہے، اس کے اختلاف وتغیرات کا دونوں کے باہمی مقابلہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، مگر دسیوں ترامیم واصلاحات کے باوجود کہا جاتا ہے کہ یہ وہی نصاب ہے، جو ہمارے مدارس میں ان کے آغاز کے اول دن سے رائج ہے، اور معلوم نہیں کیوں اس نصاب کو درس نظامی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نظامی کی یہ نسبت اگر شہرۂ آفاق مدرسہ نظامیہ بغداد سے ہے تو کس وجہ سے اور اگر خاندان علمائے فرنگی محلی کے جدامجد، حضرت مولانا ملا نظام الدین سہالوی (وفات ۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ۔ مئی ۱۷۴۸ء) سے ہے، تو کس طرح؟

کیوں کہ اول تو یہ ثابت نہیں کہ ملا نظام الدین نے کوئی ایسا نصاب علیحدہ یا خاص تعلیم مرتب فرمایا ہو، جو ملا صاحب کے حلقۂ درس اور ان کے شاگردوں میں معمول ومروج تھا اور اسی ترتیب پر بعد کی نسلوں کو بھی منتقل ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ملا نظام الدین صاحب نے ایسا کوئی نصاب مرتب نہیں کیا (۱) اگر کیا بھی ہو تو وہ اب موجود نہیں، بلکہ اس کی تفصیلات بھی مفقود ہیں۔

(۱) ملا صاحب کا قریب ترین تذکرہ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے ''مآثر الکرام'' (مؤلفہ ۱۱۶۶ھ) میں کیا ہے۔ ص: ۲۲۰/۲۲۲ طبع اول (آگرہ: ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء) مگر اس میں ملا صاحب کے کسی نصاب کا ذکر نہیں، نیز اس وقت کے مورخین اور تذکرہ نگاروں سے تذکرہ علمائے ہند، مؤلفہ مولوی رحمان علی اناامی ص: ۲۴۱/۲۴۲ (طبع دوم۔ نول کشور لکھنؤ ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء) تک، کسی نے بھی اس نصاب تعلیم کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس خانوادہ کے ایک فاضل اور مولانا ملا نظام الدین پر فاضلانہ کتاب: ''بانی درس نظامی'' کے مؤلف محمد رضا انصاری صاحب نے بھی اپنی کتاب میں ایک پورا باب درس نظامی پر لکھا ہے۔ ص: ۲۵۹-۲۶۹ (لکھنؤ ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء) مگر اس سے بھی یہ رہنمائی نہیں ملتی کہ ملا صاحب نے یہ نصاب کب مرتب فرمایا تھا اور اس کا استناد کس طرح ثابت ہے۔

نیز جن چند خاص کتابوں یا موضوعات کی وجہ سے اس نصاب کو درس نظامی کہا جاتا ہے، ان میں سے کئی اک تو وہ ہیں جو ملا فتح اللہ شیرازی کی باقیات اوران کے علمی معقولی اثرات کا ایک حصہ ہیں، چند ایسی بھی ہیں جو ملا صاحب کی وفات کے بعد وجود میں آئیں تھیں، اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ملا صاحب نے ان کتابوں کو پڑھایا بلکہ دیکھا بھی ہو، اور جو کتابیں بنیادی اصول وقواعد اور فقہ ودینیات پر مشتمل ہیں، ان میں سے اکثر کتابیں صدیوں سے ہندوستان کے مختلف حلقہ ہائے درس میں رائج اور قدیم ترین نصاب ہائے تعلیم کا حصہ رہی ہیں، اس لئے ان کو بھی ملا صاحب کے نظام سے وابستہ اور مختص نہیں کہا جاسکتا، لہٰذا اس نصاب کی ملا صاحب سے نسبت درست نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس میں جو نصاب تعلیم تقریباً ڈیڑھ سو سال سے معمول ومروج ہے، وہ برصغیر ہند کے چار اہم نصاب یا حلقہائے درس کا خلاصہ وانتخاب ہے:

(۱) خاندان علمائے فرنگی محلیؒ

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ اوران کے اسلاف واخلافؒ کا نصاب تعلیم

(۳) علمائے خیرآباد کا نصاب درس

(۴) دہلی کالج کا نصاب تعلیم

ان چاروں کے اثرات کو اس طرح سمجھا اور تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اس نصاب میں شامل کتب حدیث اور صحاح ستہ کا اہتمام حضرت شاہ ولی اللہؒ اور خانوادۂ ولی اللہیؒ کا فیضان ہے، فقہ حنفی کی اہم کتابیں اس نصاب درس کا حصہ تھیں، جو عہد مغلیہ بلکہ اس سے بھی پہلے عہد سلطنت سے ہندوستان کے علمی حلقوں میں جاری تھا۔ منطق وفلسفہ کا شغف مولانا ملا نظام الدین اور فتح اللہ شیرازی کا اثر ہے۔ فلسفہ یونان کی قدیم اور دقیق کتابوں شفا شیخ الرئیس ابن سینا، اسفار اربعہ ملا صدرا شیرازی، شرح اشارات محقق طوسی، افق المبین میر باقر داماد وغیرہ کا ذوق علمائے خیرآباد کا ورثہ ہے۔ عربی ادب کی کتابیں خصوصاً معلقات، جاہلی شعراء، نیز حماسہ، متنبی وغیرہ دہلی کالج سے منتقل ہوئی ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے بانیان گرامی، جو خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے دست گرفتہ اور جرعہ نوش تھے، دہلی کالج کے فیض علم سے بھی مملو تھے اور معقولات کے قدیم سلسلوں سے بھی فیض

پائے ہوئے تھے، اس لئے وہ ان تمام نسبتوں صلاحیتوں اور علوم کے جامع تھے، انہوں نے اپنے مدارس کے لئے مرتب اس نصاب تعلیم میں، تمام نسبتوں اور چشمہ ہائے علم سے استفادہ کا اعتراف کیا اور نصاب کی تشکیل کے وقت ہر اک سے استفادہ کا خیال رکھا۔

اس قدیم نصاب کے اکثر مرتب کرنے والوں کے ذہن ومزاج میں، اعلی درجہ کے سرکاری اداروں، کالجوں میں مسند درس وتعلیم سنبھالنے، شعبۂ تعلیم میں معزز عہدوں پر فائز رہنے اور اکثر علوم وفنون کو اعلی درجہ کے استادوں سے پڑھنے اور لمبے عرصہ تک ان کو پڑھانے اور گہرے تعلیمی تجربات کی وجہ سے، ایک خاص قسم کی جامعیت، رچاؤ اور اثر اندازی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک نے جب پرانے تمام مدارس اور مراکز تعلیم کو بے نام ونشان کردیا، تو ان حضرات نے اپنے علمی تعلیمی تجربہ کو، نئے ماحول اور مستقبل کی ضروریات کے پیش نظر نئے انداز سے مرتب کیا، یہی وہ سب سے پہلا نصاب تعلیم ہے جو ان حضرات نے، دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور دونوں میں، ان کے قیام اور پہلے تعلیمی سال کے وقت مرتب اور نافذ فرمایا تھا۔

دیوبند وسہارنپور کے دونوں اسلامی مدرسے (جو بعد میں دارالعلوم اور مظاہر علوم کے نام سے موسوم ومشہور ہوئے) ایک ہی سال میں، ایک ہی مقصد کے لئے ایک ہی نہج پر قائم ہوئے تھے۔ دارالعلوم کا افتتاح یکم محرم الحرام سنہ ۱۲۸۳ھ (۱۶ مئی ۱۸۶۶ء) کو ہوا تھا، مظاہر علوم کا اس کے چھ مہینہ بعد، رجب ۱۲۸۳ھ/۲۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ دونوں مدرسوں نے اپنے آغاز کے ساتھ ہی، دس سال کا مکمل نصاب تعلیم منتخب اور وضع کرلیا تھا، جس سے ان مدارس کے بانیین کی بلند نظری، رفعت پرواز اور نہایت دوررس منصوبوں اور عالی مقاصد کا بھی ضمناً اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ صرف ایک اتفاق یا توارد نہیں کہ دونوں مدرسوں کے ذمہ داروں نے سال اول یا آغاز تعلیم سے فراغت وفضیلت یا آخری کتابوں تک، عربی کی کتابوں اور دینیات کا نصاب ایک ہی طرح کا اور ایک ہی نہج پر مرتب فرمایا تھا، اگرچہ مظاہر علوم کے نصاب میں چند (صرف پانچ) کتابیں دارالعلوم سے زائد تھیں۔

اس ابتدائی نصاب میں حدیث شریف کی اعلی ترین کتابوں کی ایک خاص ترتیب پر تعلیم کے علاوہ بھی جو جامعیت وہمہ گیری ہے، وہ لائق توجہ ہے۔ عقلی علوم خصوصاً ہیئت (MORPHOLOGY)

ہندسہ (GEOMETRY) اور ریاضی (ARITHMATIC) وغیرہ کی ضروری فنی تعلیم، فارسی کا اعلیٰ درجہ کی کتابوں کے ذریعہ فاضلانہ درس، عربی وفارسی اردو، تینوں زبانوں سے ایک دوسری زبان میں ترجمے کی لیاقت اور مہارت تھی، یہی اس نصاب کا خاص جوہر اور بنیادی حصہ تھا۔ اس وقت کے نصاب اور بعد کے معمول نصابات میں ایک بہت نمایاں اور واضح فرق یہ ہے کہ دارالعلوم میں چھٹے درجہ اور مظاہر میں آخری درجات تک، فارسی کی اعلی درجہ کی فنی تعلیم اور ریاضی ضروری تھی، جس میں درجہ بہ درجہ ترقی ہوتی رہتی تھی۔

ایک اور بڑا موضوع یا پہلو جس سے درس میں شامل، تمام کتابوں اور علوم وفنون میں طاقت آتی تھی اور جملہ موضوعات کو فنی قوت ملتی تھی، ترجمہ کی صلاحیت کا تھا۔ فارسی کی پہلی جماعت سے تعلیم کے اختتام تک، ہراک درجہ اور جماعت کے لئے ضروری تھا کہ وہ ترجمہ کے فن میں بھی مہارت ودسترس حاصل کریں، جس کی ابتدا اردو کے فارسی اور فارسی کے اردو ترجمہ سے ہوتی تھی، اس کے بعد اردو سے عربی، عربی سے اردو، فارسی سے عربی، عربی سے فارسی اور دونوں سے اردو میں ترجمہ پر محنت کرائی جاتی تھی، جیسے جیسے طالب علم تعلیمی درجات میں آگے بڑھتا، اس کی ترجمہ کی لیاقت بڑھتی چلی جاتی تھی۔

دونوں مدرسوں کا نصاب تعلیم دس یا گیارہ سال کا تھا، دارالعلوم کا دس سال کا، مظاہر کا گیارہ سال کا۔ جو قرآن مجید کے علاوہ کہ وہ تو اصل اصول علوم ہے، عربی فارسی کی تمام کتابوں میں بڑی حد تک مشترک تھا، مظاہر علوم میں پہلا سال قرآن مجید کی تکمیل اور ابتدائی فارسی کے لئے مختص تھا، دارالعلوم کے نصاب کا قرآن کریم کی تکمیل کے بعد، فارسی کی ابتدائی کتابوں سے آغاز ہوتا تھا، اس کے بعد، دونوں مدارس کے مجموعی نصاب کی درجہ بہ درجہ تفصیل درج ذیل ہے:

۱-سال اول ـــــ میزان منشعب، صرف میر [مظاہر علوم میں ان پر، وغیرہ کا اضافہ ہے]

۲-سال دوم ـــــ دستوارالمبتدی، شرح مائۃ عامل، نحو؟

۳-سال سوم ـــــ ہدایۃ النحو، ایساغوجی، منیۃ المصلی، مراح الارواح

۴-سال چہارم ـــــ کافیہ، تہذیب، قال اقول مرقاۃ، قدوری، فصول اکبری [مظاہر کے نصاب میں تہذیب شامل نہیں]

۵-سال پنجم ـــــ شرح ملا جامی، شرح تہذیب، شرح وقایہ، شافیہ، مقامات ہندی، کلیلہ ودمنہ، [مظاہر میں کلیلہ ودمنہ شامل نہیں تھی]

۶-سال ششم ـــــ قطبی، میر قطبی، مختصر معانی، اصول الشاشی، نورالانوار، مقامات حریری [مظاہر میں شرح فقہ اکبر کا اضافہ تھا]

۷-سال ہفتم ـــــ میبذی، شرح عقائد توضیح وتلویح، سراجی، دیوان متنبّی۔

۸-سال ہشتم ـــــ جلالین، مشکوۃ، ترمذی، تاریخ یمینی، علم ادب (کذا؟) [مظاہر میں تیسیر الوصول الی جامع الاصول کا اضافہ تھا]

۹-سال نہم ـــــ بیضاوی، ہدایہ، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی [مظاہر علوم میں سبعہ معلقہ کا اضافہ تھا]

۱۰-سال دہم ـــــ صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک [مظاہر میں تین کتابوں کا اضافہ تھا: ترجمہ قرآن مجید، خطبہ قاموس، درمختار]

تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ دس یا گیارہ سال کا لمبا نصاب تعلیم، صرف پینتالیس کتابوں پر [مظاہر علوم میں پچاس کتابوں پر] مشتمل تھا۔ یعنی ہر اک سال میں اوسطاً پانچ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، جو تمام بنیادی، فنی اصولی کتابیں تھیں، عموماً چار یا پانچ کتابوں میں پورا فن پڑھا دیا جاتا تھا۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے:

(۱) صَرف کی صرف تین کتابیں تھیں: دستور المبتدی۔ فصول اکبری۔ شافیہ۔

(۲) نحو کی چھ: نحو میر۔ شرح مأۃ عامل۔ ہدایت النحو۔ مراح الارواح۔ کافیہ اور شرح جامی۔

(۳) منطق کا نصاب بھی فقط چھ کتابوں کا تھا: ایساغوجی۔ قال اقول۔ مرقاۃ۔ شرح تہذیب، قطبی میر قطبی۔

(۴) فلسفہ کی صرف ایک کتاب شامل تھی: میبذی۔

(۵) معانی و بیان اور بلاغت میں صرف ایک کتاب تھی: مختصر معانی۔

(۶) عقائد میں دار العلوم میں صرف ایک کتاب تھی: شرح عقائد [مظاہر علوم میں اس سے پہلے شرح فقہ اکبر بھی پڑھائی جاتی تھی]

(۷) اصول فقہ صرف تین کتابیں تھیں: اصول الشاشی۔ نورالانوار۔ توضیح وتلویح۔

(۸) فقہ میں پانچ کتابیں: منیۃ المصلی۔ قدوری۔ شرح وقایہ۔ ہدایہ اور سراجی [مظاہر میں درمختار بھی مکمل پڑھائی جاتی تھی]

(۹) عربی ادب جونصاب کا ایک مرکزی حصہ تھا، اس میں چھے کتابیں پڑھائی جاتی تھیں: منتخبات ادب عربی۔ مقامات ہندی۔ کلیلہ ودمنہ۔ مقامات حریری۔ دیوان متنبی اور تاریخ یمنی [مظاہر علوم میں سبعہ معلقہ کا اضافہ تھا]

(۱۰-۱۱) یہ اصول اور معقولات کی کتابیں تھیں، کلیدی علوم جو اس نصاب کا مقصد تھے، یعنی تفسیر قرآن مجید، حدیث شریف، تفسیر میں جلالین کو اولیت حاصل تھی، اس کے بعد بیضاوی کا نصف اول یا کچھ حصہ پڑھایا جاتا تھا، مظاہر علوم میں قرآن مجید کا مکمل ترجمہ بھی داخل نصاب تھا۔

حدیث میں مشکوۃ المصابیح کے علاوہ صحاح ستہ اور مؤطا امام مالک پڑھائی جاتی تھیں [مظاہر علوم میں تیسیر الاصول بھی شامل نصاب تھی]

درج بالا نصاب حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مرتبہ نصاب نیز خانوادۂ ولی اللہی اور دہلی کالج میں رائج نصاب تعلیم کا عمدہ خلاصہ ہے۔ یہ دونوں مراکز طالب علم میں جو صلاحیتیں پیدا کرنی چاہتے تھے اور جس طرح کے افراد تیار کرنا چاہتے تھے، اس نصاب میں ان دونوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ ہمارے مدارس کے بانیوں نے دونوں نصابوں کا عمدہ امتزاج کر کے اعلیٰ قابلیت کے اصول کا اہتمام بھی کیا ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ کے طریقہ اور مقاصد تعلیم کی پاسداری کا بھی۔

اس نصاب میں کئی باتیں موجودہ مشہور ومعمول نصاب سے مختلف ہیں: پہلے نصاب میں عربی ادب خصوصاً قدیم عربی کی تفہیم اور نظم ونثر کی تعلیم کی ایک مسلسل ترتیب ہے، سال چہارم میں کافیہ کے ساتھ عربی ادب کی منتخب کتابیں شروع ہو جاتی تھیں، جو نصاب کے مکمل ہونے تک ترقی کرتی ہوئی چلی جاتی تھیں۔

حدیث شریف کی تعلیم کے لئے تین سال مختص کئے گئے تھے، جس کی ترتیب نہایت عمدہ تھی، پہلے سال میں مشکوۃ کے ساتھ سنن ترمذی ہوتی تھی، دوسرے سال میں سنن ابوداؤد، سنن نسائی اور ابن ماجہ۔ درس حدیث کے تیسرے اور آخری سال میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطا امام مالک پڑھائی جاتی تھیں، جس سے حدیث شریف سے گہری مناسبت پیدا ہو جاتی، صحاح ستہ کے امتیازات واختلافات کا بھی خاصا علم ہو جاتا تھا اور حضرت شاہ ولی اللہ کے طریقۂ تعلیم اور ترجیح مؤطا کے اصول پر بھی عمل ہو جاتا تھا۔ اگر موجودہ دور اور نصاب ہائے تعلیم میں بھی دورۂ حدیث شریف یا صحاح ستہ کے اسی ترتیب کے مطابق پڑھانے کا اہتمام ہو تو خدمت وتعلیم اور مقاصد حدیث کی تفہیم کے لئے یہ موجودہ طریقۂ تعلیم (بلکہ تلاوت) سے بہت بہتر مفید

اورزیادہ نفع بخش ثابت ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ! اس سے حدیث شریف کے مقاصد ومطالب کی بھی زیادہ توضیح وتشریح ہوسکے گی اورطلبہ کوحدیث شریف میں بھی دیر تک غواصی اوراستفادہ کاموقع نصیب ہوگا۔

قدیم نصاب میں منطق وفلسفہ کے دیر تک پڑھنے کا معمول نہیں تھا،متوسطات میں قطبی اورمیر قطبی منطق کی آخری کتابیں تھیں، جونصاب درس میں شامل تھیں،اس کے بعد منطق کا کچھ تذکرہ نہیں۔فلسفہ قدیم کی صرف ایک کتاب میبذی تھی، جوسال ہفتم میں پڑھائی جاتی تھی، اس پرفلسفہ کی تعلیم کا باب بھی بندہوجاتا تھا۔علمائے مظاہرعلوم تو منطق وفلسفہ کی مزید تعلیم کومدرسہ کے مقاصد سے ہی خارج کئے ہوئے تھے ،وہ اس کومدرسہ کے لئے چندہ دینے والوں کی نیت کے خلاف سمجھتے تھے۔ذمہ داران مظاہرعلوم کا فرمان تھا کہ:

''ان لوگوں نے ثواب آخرت کے لئے چندہ دیاہے، اس لئے وہی علوم پڑھانے چاہئیں جن سے آخرت مطلوب ہو''(۱)

اس صراحت کے ساتھ ان عقلی کی فہرست اورتفصیل بھی دیکھئے جومظاہرعلوم کے علاوہ دارالعلوم کے نصاب کا جزءلاینفک اوربنیادی حصہ بنے ہوئے تھے جس سے یہ بات بے تکلف سمجھ میں آتی ہے کہ ان مدرسوں کے جلیل القدر بانیین خوب جانتے ہیں اورسمجھتے تھے کہ مدرسہ کے نصاب میں شامل عقلی علوم کی شمولیت کے بغیرویسے افرادنہیں پیداہوسکتے جوان مدرسوں کا بنیادی مقصداورسرمایہ ثابت ہوں۔

یہ عربی نصاب کی تفصیل تھی لیکن ان مدارس کے نصاب اورسلسلۂ تعلیم کا اسی پراختتام نہیں ہوجاتا تھا، بلکہ اس کے ساتھ(جیسا کہ ذکرہوا) تین موضوعات اوربھی تھے ،جوتکمیل نصاب کے لئے گویا شرط کی حیثیت رکھتے تھے، جس میں اول درجہ فارسی کا تھا۔دیوبنداورسہارنپور دونوں کے مدارس میں،تعلیم کے آغاز سے فارسی کی اعلیٰ درجہ کی فنی تعلیم کا بھی اہتمام فرمایاگیاتھا، جودونوں مدرسوں میں چوتھے درجہ تک ایک ہی ترتیب پرتھا،وہی کتابیں ویساہی طریقۂ تعلیم اورطلبہ پراس کی ویسی ہی ذمہ داری تھی۔فارسی کتابوں کانظام تعلیم اوراسباق کی ترتیب یہ تھی:

سال اول میں: گلستاں،صفوۃ المصادر،انشائے خلیفہ
سال دوم میں: بوستاں، زلیخا،مصدرفیوض

(۱)روداد مدرسہ عربیہ(مظاہرعلوم)سہارنپور سنہ ۱۲۹۱ھ ص: ۶

سال سوم میں: انوار سہیلی، رقعات عالمگیری، رسالہ عبدالواسع، رسالہ روشن علی انصاری

سال چہارم میں: ابوالفضل، سکندر نامہ

مندرجہ بالا کتابیں دارالعلوم اور مظاہر علوم دونوں میں مشترک تھیں، دارالعلوم میں فارسی کا اسی پر اختتام ہوجاتا تھا، لیکن مظاہر علوم میں دورۂ حدیث کے اختتام تک فارسی کی تعلیم جاری رہتی تھی، جس کے لئے کتابوں کا نہایت عمدہ انتخاب کیا گیا تھا، تفصیل ملاحظہ ہو:

سال پنجم میں: مدارج النبوہ، [سیرت شریفہ تالیف: علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ] جواہر الترکیب

سال ششم میں: نفحات الانس [تذکرہ اولیاء اللہ تالیف: مولانا ملا عبدالرحمان جامی] اخبار الاخیار [تذکرہ مشائخ وعلمائے ہند، تالیف: علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی]

سال ہفتم میں: اخلاق جلالی [علامہ جلال الدین دوّانی] علم عروض

سال ہشتم میں: قصائد عرفی [شیرازی] معارج النبوۃ [سیرت شریفہ، تالیف، ملامعین کاشفی ہروی]

سال نہم میں: تزک جہانگیری [خودنوشت وسرگذشت نورالدین جہانگیر]

سال دہم میں: تحفۃ العراقین [خاقانی]

یعنی یہ نصاب اصول وقواعد، زبان وادب، سیرت وتاریخ، تصوف واخلاق وغیرہ بنیادی اہم موضوعات کا بہترین معلم اور نمائندہ وترجمان تھا۔ قواعد واصول کی معتبر کتابیں رسالہ عبدالواسع ، رسالہ روشن علی انصاری اور جواہر الترکیب فارسی کی فنی قابلیت میں اضافہ کرتی تھیں، زبان وادب کے جوہر گلستاں، بوستاں، رقعات عالمگیری سے کھلتے تھے، اخلاق وتربیت کا سبق انوار سہیلی اور اخلاق جلالی سے ملتا تھا، سیرت پاک کی تفصیل اور روایات مدارج النبوۃ اور معارج النبوۃ سے حاصل معلوم ہوتی تھیں، امت کے مشہور بزرگوں اور اولیاء اللہ کے احوال وملفوظات ملا جامی کی نفحات الانس سے معلوم ہورہے تھے، ہندوستان کے اکابر علماء اور مشائخ سے واقفیت کے لئے شیخ عبدالحق محدث کی اخبار الاخیار مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی تھی اور رکھتی ہے، تاریخ ہند سے واقفیت کے لئے تزک جہانگیری سے استفادہ ہورہا ہے، جو فارسی میں تاریخ اور خودنوشت سوانح کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ فارسی ادب کی اعلیٰ قابلیت میں جو کچھ کمزوری رہ گئی ہو اس کی تلافی کے لئے عرفی کے قصائد اور (خاقانی کی) تحفۃ العراقین بے نظیر سرمایہ ہے۔

یہ تمام کتابیں عربی درسیات کے جلو میں چلتی تھیں، چند سبق عربی درسیات کے چند فارسی کے۔ ان

دونوں زبانوں کی علمی قابلیت کے ساتھ، دونوں بلکہ تینوں زبانوں میں ترجمہ کی یکساں لیاقت سونے پر سہاگہ کا کام کرتی تھی، اس لئے جب کوئی طالب علم مظاہر علوم یا دیوبند سے ان علوم وفنون سے آراستہ ہوکر نکلتا تھا، تو دنیا اس کے استقبال کے لئے چشم براہ ہوتی، اس کو معاش کی جستجو نہ کرنی پڑتی تھی، ذرائع معاش خود اس کی تلاش میں رہتے تھے، علم وفضل کے قدرداں اور باصلاحیت افراد کے متلاشی ان فارغین کو ہاتھوں ہاتھ لیتے، جس کی وجہ سے ان کا مدرسہ سے نکلنے کے بعد ہر اک قدم ترقی وکامرانی اور اکثر حالات میں معاش کی فراوانی کی طرف بڑھتا تھا۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ:

کعبہ را ہردم تجلی می فزود
ایں ز اخلاصات ابراہیم بود

کچھ ایسی ہی کیفیت ان مدارس سے فارغ طلبہ کی بھی ہوتی تھی، جو بلاشبہ ان مدارس کے بانیین کے اخلاص کے علاوہ اس عمدہ جامع اور بہترین نصاب تعلیم کا بھی اثر تھا۔

اگرچہ یہ استعداد وصلاحیت مدرسوں کے فارغین کے لئے ایک تمغۂ اعزاز تھی، مگر ان دونوں مدرسوں کا نصاب مرتب کرنے والے حضرات نے صرف اس لیاقت کو کافی نہیں سمجھا تھا، بلکہ انہوں نے درج بالا موضوعات کے علاوہ علوم عقلیہ، ریاضی ہندسہ (GEOMETRY) ہیئت (MORPHOLOGY) کو بھی نصاب کا ضروری حصہ بنادیا تھا، جو اکثر حالات میں اختیاری (OPTIONAL) نہیں، بلکہ لازمی (COMPULSARY)

---

(۱) یہ مفصل نصاب تعلیم مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند اور مدرسہ عربیہ [مظاہر علوم] سہارنپور کی سال اول کی روداد میں چھپا ہے۔

دارالعلوم کی سال اول کی روداد، بلکہ دارالعلوم کی سال آغاز سے سنہ ۱۳۲۰ھ تک تمام رودادوں کی دو، دو اشاعتیں ہیں، پہلی اشاعت وہ ہے جو مدرسہ کے معمول کے مطابق ہر اک نئے ہجری سال کے آغاز پر چھپتی تھی، دوسری اشاعت وہ ہے جو مطبع قاسمی دیوبند سے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے اہتمام سے شائع ہوئیں تھیں، چوں کہ پرانی تمام رودادیں کم یاب اور خستہ ہوگئی تھیں اس لئے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے پہلے سال کی روداد سے سنہ ۱۳۲۰ھ تک بلکہ اس کے بعد کی بھی تمام رودادوں کے سو سو ڈیڑھ سو نسخے نئی کتابت سے چھپوادیے تھے، راقم نے دونوں اشاعتوں سے استفادہ کیا ہے۔ سال اول کی روداد کا ایک قلمی نسخہ بھی میرے سامنے رہا ہے، جو غالباً حضرت نانوتوی کے ایک شاگرد اور دارالعلوم کے ابتدائی طالب علم مولانا فاضل پھلتی کے قلم کا ہے۔ [بشکریہ مولانا حکیم رضی الدین احمد صاحب پھلت، مظفرنگر]

مظاہر علوم کے پہلے سال کی روداد جو اس دور کے ایک ہفت روزہ، نجم الاخبار میرٹھ کے ضمیمہ کے طور پر چھپی تھی، راقم سطور کے سامنے ہے۔ [بشکریہ مولانا محمد شاہد صاحب سہارنپور]

تھا۔طلبہ کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان مضامین کو پڑھیں اور ان میں مہارت حاصل کریں۔ان مدرسوں کے بانی اور سربراہان اچھی طرح جانتے تھے کہ ریاضی وغیرہ کی عمدہ صلاحیت ذہن کے نشوونما کے علاوہ، متعدد دینی علوم کی تفہیم اور اکثر دنیاوی معاملات ومسائل کو جانچنے اور ان میں ترقی کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

دارالعلوم اور مظاہرعلوم دونوں میں پہلی جماعت سے درجۂ ششم تک ریاضی اور اس کے متعلقات نصاب میں شامل تھے، جو سال اول میں جمع وتفریق کے حساب سے، سال ششم میں اقلیدس کی شکل اول تک آگے بڑھتے، ترقی کرتے تھے۔

یہ وہ نصاب اور علوم تھے جن کو دارالعلوم دیوبند اور مظاہرعلوم کے بانیان گرامی مرتبت نے اپنے مدرسوں کے طالب علموں اور ملت کے تازہ واردنونہالوں کے لئے مرتب ومنتخب فرمایا تھا، مگر بعد میں موقع بہ موقع اس میں اس قدر ترمیمات ہوئی ہیں کہ موجودہ نصاب کو ان حضرات کے مرتبہ، سب سے پہلے نصاب سے گویا کوئی نسبت ہی باقی نہیں رہی۔ریاضی وغیرہ تو برسوں سے نصاب بلکہ بحث وگفتگو سے بھی خارج ہے، فارسی کو بھی شابخیر مابسلامت کہدیا گیا ہے، گنتی کے چند مدارس ہیں جہاں فارسی کی تعلیم کا کچھ سلسلہ وانتظام ہے بہ ظاہر وہ بھی کچھ دنوں میں قصۂ ماضی ہوا چاہتا ہے۔سب سے بڑا تغیر جس سے اس نصاب کی روح اور مردم گری وشخصیت آفرینی کا جوہر غیر معمولی طور سے متأثر ہوا ہے، حدیث شریف کے طریقۂ تعلیم میں تبدیلی اور عربی زبان کی لیاقت وتعلیم پر گہری توجہ کا فقدان نیز ترجمہ کے فن سے قطعاً اور گویا دائمی بےتعلقی ہے، اس لئے عرصہ سے نہ ویسے افراد پیدا ہورہے ہیں، نہ ہی موجودہ تعلیم کے ویسے اثرات ونتائج ظاہر ہورہے ہیں۔

اس نصاب کا ایک غیرمعمولی فائدہ اور امتیاز یہ تھا کہ اس نصاب سے جو طلبہ اسی ترتیب کے مطابق تعلیم مکمل کرلیتے تھے وہ مدرسہ سے فارغ ہوتے ہی، بیک وقت استاد معلم، محقق مصنف اور مترجم ہر کام اور منصب کے لائق ہوتے تھے، ان کے ذریعہ سے مدرسوں کا نظام بھی حسن وخوبی کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا تھا نیز یہ فارغین ہر اک علمی ضرورت کے عمدہ طریقہ پر پورا کرنے والے ثابت ہوتے تھے، جس کی وجہ سے مطابع اور ناشرین کو اچھے ذی علم حاشیہ نگار، تصحیح کرنے والے بھی مل جاتے تھے اور علمی دنیا بھی ان کی تصنیف وتحقیق اور نئی کتابوں

کے ترجموں سے اپنے علم میں اضافہ محسوس کرتی تھی، ترجمے بھی ایسے جو علمی لیاقت واستعداد میں اضافہ کا سامان ثابت ہوتے تھے، اصل کتابوں کے قاتل اور بے بضاعتی کا دفتر نہیں لگتے تھے، ترجموں کی متواتر مصروفیت کے علاوہ، اعلیٰ عمدہ کتابوں کی تصنیف کا معمول بھی تازہ وبرقرار رہتا تھا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی بہت ضروری ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے سنہ ۱۲۹۰ھ (جنوری ۱۸۷۴ء) میں دارالعلوم کے جلسہ سالانہ میں مدارس کے نظام اور مقاصد پر ایک اہم اور معرکہ آرا تقریر فرمائی تھی، جس میں اس کی صراحت فرمائی تھی کہ علوم دینیہ اسلامیہ کی تکمیل کے علاوہ، ہماری غرض اعظم یہ بھی ہے کہ طلبہ میں ایسی اعلیٰ درجہ کی ذہنی قوت پیدا اور بیدار ہو، جس کے ذریعہ سے وہ قدیم علمائے اسلام کے ہم قدم شمار ہو جائیں، ان کا نمونہ اور مثنیٰ بن سکیں۔ حضرت مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''ان مدارس میں علاوہ تعلیم مذہبی غرض اعظم قوت استعداد ہے، فقط علوم دینی پر اکتفاء نہیں، بلکہ فنون دانشمندی کی تکمیل بھی حسب قاعدہ سابقہ کی گئی ہے۔ جس کا عمدہ نتیجہ پہلے زمانوں میں یہ ہوا تھا کہ بڑے بڑے عالم، بڑی بڑی استعداد وقوت کے اہل اسلام میں بہ کثرت پیدا ہوئے''

حضرت نانوتوی کا یہ ارشاد برصغیر ہند میں سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد قائم، تمام مدرسوں اور دینی تعلیمی اداروں کے لئے ایک اصول اور نظریہ ساز دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور تمام مدارس کے مقاصد کا ایک اہم ترجمان بھی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگر چہ ان مدارس کی وجہ تاسیس اور ان کا اصل بنیادی مقصد، علوم دینیہ اسلامیہ شرعیہ کی حفاظت وبقاء کی جدوجہد اور ان کی تعلیم واشاعت کی فکر کرنا ہے، ان مدارس کے قائم کرتے وقت اسی کو اصل اصول بنایا گیا تھا مگر معقولات میں منطق وفلسفہ کے علاوہ وہ، تمام عقلی فکری موضوعات اور علوم ومباحث (جن سے نظام عالم جڑا ہوا ہے) بھی، ان مدارس کے مقاصد اور نصاب تعلیم سے خارج نہیں تھے۔ کیوں کہ وہ حضرات اس حقیقت سے بہت گہرائی سے واقف تھے کہ اگر ان مدرسوں کے فارغین دین وشریعت میں اعلیٰ صلاحیت کے ساتھ، ضروری عقلی علوم سے بھی آشنا ہوں گے، تو ان کا دائرۂ فکر وعمل بہت وسیع ہو جائے گا اور ان کی رہنمائی اور جدوجہد کے اثرات وثمرات، زیادہ عمیق اور ایسے دوررس نتائج پیدا کرنے والے ہوں گے، جس طرح قدیم زمانہ کے منتخب روزگار علماء اور ماہرین کے ہوتے تھے۔ حضرت مولانا نانوتوی کی رائے میں معقولات کا دائرہ کس درجہ وسیع تھا، اس کی اسی تقریر کے ایک اور اہم فقرہ سے وضاحت ہو رہی ہے، فرماتے ہیں:

''معقولات سے صرف منطق وفلسفہ مقصود نہیں، بلکہ اس میں ہئیت، حساب، فلکیات، ریاضی اور الہیات بھی بھی شامل ہیں'' (۱)

یعنی حضرت مولانا نانوتوی کے پیش نظر مستقبل کے لئے جو وسیع تعلیمی مقاصد اور دیرپا ہمہ جہت نظام تعلیم تھا، اس میں معقولات کے لئے صرف منطق وفلسفہ کی تجویز ونشاندہی نہیں تھی، بلکہ معقولات کو اس کے وسیع اور صحیح معنوں میں لیا گیا تھا، جس میں تمام قابل ذکر موضوعات کی تعلیم وتدریس بھی شامل تھی۔ حضرت مولانا کی صراحت کے مطابق وہ علوم جو (معقولات کا حصہ ہیں) ان مدارس میں پڑھائے جانے چاہئیں، یہ تھے:

حساب ________ MATHEMATICS

ہندسہ ________ GEOMETRY

ہیئت ________ MORPHOLOGY

فلکیات ________ COSMOLOGY

یہ بات بھی خاص توجہ چاہتی ہے کہ حضرت مولانا، دینی مدرسوں کے لئے ضروری عقلی علوم ومباحث میں:

الہیات   [مابعد الطبعیات]   METAPHYSICS

کو بھی شامل فرما رہے ہیں۔

اگرچہ حضرت مولانا اس کی تقریر میں تذکرہ نہیں، لیکن دارالعلوم ومظاہر علوم کی حضرت مولانا نانوتوی کی حیات میں شائع [وفات ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء] رودادوں سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ان دونوں مدرسوں میں، درج بالا علوم ومضامین کے علاوہ:

(۱) حضرت مولانا نانوتوی نے یہ تقریر مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) کے سالانہ جلسہ دستار بندی میں سنہ ۱۲۹۱ھ (۹ جنوری ۱۸۷۴ء) کو فرمائی تھی، یہ تقریر اس سال کی روداد میں چھپی تھی، مکمل تقریر کے لئے ملاحظہ ہو: روداد سنہ ۱۲۹۰ھ ص: ۱۰ تا ص: ۱۷ اور مذکورہ فقرہ کے لئے ص: ۱۵۔ مطبوعہ محرم ۱۲۹۱ھ (فروری ۱۸۷۴ء)۔ یہ تقریر دارالعلوم کی تاریخ پر متعدد اہم مآخذ میں ایک دستاویز اور نظریہ ساز تقریر کے طور پر بھی شامل ہے، مثلاً ملاحظہ ہو:

الف: روداد موتمر الانصار، مرادآباد: ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۱ء مطبع قاسمی دیوبند

ب: ماہنامہ القاسم دیوبند کا دارالعلوم دیوبند نمبر (۱۳۶۰ھ) وغیرہ

الجبرا(یاجبر ومقابلہ)	ALGEBRA
مساحت	MENSURATION
اقلیدس	EUCLID'S ELEMENTS

بھی پڑھائے جاتے تھے اور شامل نصاب تھے۔ یہی نہیں بلکہ طلبہ میں مزید لیاقت وقابلیت کے لئے دو اور موضوعات کی بھی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا نظام بنایا گیا تھا، طب ومعالجات اور فن تعمیر ونقشہ سازی (Civil Engineering and Architect)

دارالعلوم قائم ہونے کے بعد دارالعلوم میں طب یونانی کی تعلیم جلد ہی شروع ہوگئی تھی، لیکن شروع میں تمام طبی کتابوں کی تعلیم کا اہتمام نہیں تھا، جس کا ذمہ داران مدرسہ کو خاصا احساس تھا، وہ طلبہ کی بہتری کے لئے طب یونانی کے نصاب کی فاضلانہ تعلیم وتکمیل چاہتے تھے، اس لئے سنہ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں طب یونانی کی مکمل تعلیم کا انتظام فرمایا گیا، جس کا اعلان ان الفاظ میں شائع ہوا تھا:

''کیفیات سنین ماضیہ سے جملہ خیرخواہان مدرسہ کو واضح ہوا ہے کہ کتنے طلبہ اس مدرسہ سے علوم عربیہ میں عالم وفاضل ہوئے اور آئندہ کو انشاء اللہ ہونے والے ہیں، مگر ارباب مشاورت مدرسہ ہذا نے، جب فکر کامل دیگر فوائد رفاہ عام برادران اہل سلام پر کیا، تو ابھی تک ایک امر کثیر المنافع یعنی ترویج وتکمیل علم طب یونانی کی کمی ہے اور اس کی درستگی اور تکمیل ضروریات بلکہ واجبات میں سے ہے، کیوں کہ اس سے فائدہ عام ہے''(۱)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کو، جو دارالعلوم کے صدر مدرس اور علمی نگراں بھی تھے طب یونانی سے خاص دلچسپی تھی، مولانا طب کی چھوٹی بڑی کتابیں شوق سے پڑھاتے تھے۔ جب مدرسہ میں طب یونانی کی تکمیل کا اعلان وانتظام ہوا، اس وقت مدرسہ کے طبی نصاب کی بنیادی کتابیں یہ تھیں:

قانونچہ۔ اقصرائی۔ شرح اسباب۔ نفیسی۔ سدیدی۔ کلیات قانون شیخ۔ حمیات قانون۔

دارالعلوم کے امتحانات میں ان کتابوں کا بھی امتحان ہوتا تھا، اور ان کتابوں کے اچھے نمبرات کے طلبہ کے لئے نئے سال میں تعلیمی ترقی اور داخلہ میں مددگار ہوتے تھے، طب کی صرف رسمی تعلیم اور کتاب خوانی ہی نہیں تھی

(۱) روداد سنہ ۱۲۹۵ھ۔ نیز روداد موتمر الانصار، مرادآباد ص: ۳۳

بلکہ اس کی عمل مشق بھی کرائی جاتی تھی اور اہل مدرسہ کی تمنا تھی کہ اگر مدرسہ میں جراحی کے عمدہ آلات [SURGICAL INSTRUMENTS] اور طب کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہو اور اہل مدرسہ کی اس قدر مالی معاونت کی جائے، جس سے اہل فن، صاحب نظر دواساز اصحاب کی خدمات حاصل کی جاسکیں تو فن دواسازی [PHARMACOLOGY] بھی طلبہ کو سکھایا جائے گا، جس سے اس فن کی تعلیم اور عملی مشق کو چار چاند لگ جائیں گے۔ سنہ ۱۲۹۶ھ کی روداد میں اس مقصد سے شائع ایک اعلان کی چند سطور ملاحظہ ہوں:

> ''اگر حضرات خیر خواہان اس طرف کامل توجہ فرما کر، قوم کی بھلائی کے لئے امداد کامل کا فکر فرمائیں گے، تو آئندہ طلبہ کے لئے طریقۂ مطب اور فن جراحی اور تراکیب ادویہ کے سکھلانے کے سامان بھی مہیا کئے جاویں گے'' (۱)

بلاشبہ یہ تمام اعلانات طب یونانی کے حوالہ سے ہیں، مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت سنہ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) تک اور اس کے بعد کے دور میں بھی، انگریزی طریقۂ علاج (ALLOPATHY) ہندوستان میں متعارف نہیں تھا، پچانوے فیصد امراض میں طب یونانی سے رجوع کیا جاتا تھا، طب یونانی ہی اس وقت کا معروف ومقبول ترین طریقۂ علاج [SYSTEM OF TREATMENT] تھا۔ اگر اس وقت انگریزی طریقہ عام کو شہرت ومقبولیت حاصل ہوتی تو اکابرین مدرسہ دیوبند اس پر بھی غالباً اسی طرح توجہ مبذول رکھتے اور اس کی تعلیم سے غفلت نہ فرماتے ؟

یہ تو نصاب تعلیم کی بات تھی، اب یہ دیکھئے کہ ان مدارس اسلامیہ میں ان علوم وفنون کے پڑھانے کے لئے کیسے کیسے منتخب زمانہ اور نادر روزگار افراد جمع کئے گئے تھے، اس کا اس سے اندازہ کر لیجئے کہ مدرسہ دیوبند کے نائب صدر مدرس اور معقولات اور ریاضی وغیرہ کے ایک بڑے استاد، مولانا سید احمد دہلوی (۲) کے متعلق، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ایک تقریر میں فرمایا تھا:

---

(۱) روداد ص: نیز روداد موتمر الانصار، مرادآباد ص: ۳۴

(۲) مولانا سید احمد دہلوی، مولانا میر سید محبوب علی دہلوی کے بھانجے اور ممتاز فاضل تھے، شعر ادب اور فارسی میں غالب کے شاگرد تھے، حدیث حضرت شاہ عبدالغنی مجددی سے پڑھی تھی۔ آخر میں دیوبند سے ترک ملازمت کر کے بھوپال چلے گئے تھے، بھوپال میں سنہ ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) میں وفات ہوئی۔ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کے ایک شاگرد اور خلیفہ مجاز، قاری حسن رضا بھوپالی، مولانا سید احمد کے پرپوتے تھے۔

''مولوی سید احمد صاحب کو خداوند کریم نے ان فنون میں وہ استعداد و مناسبت عطا فرمائی ہے کہ ان فنون کے موجدوں کو بھی شاید اتنی ہی ہو'' (۱)

یہ تو صاحب خانہ کی شہادت تھی، ایک رائے اور پڑھ لیجئے جو ان دینی اداروں کی مخالف، برطانوی حکومت کے ایک اعلیٰ نمائندہ کے مشاہدہ پر مبنی ہے، اور ''الفضل ماشهدت به الاعداء'' کی ایک مثال ہے:

ممالک شمالی وجنوبی کے گورنر [سرجان اسٹریچی JOHN STRACHEY ۱۸۲۳ھ-۱۹۰۷ء] کا ۳۰ر جنوری سنہ ۱۸۷۵ء (۲۱ر ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ) کو دیوبند میں قیام ہوا تھا، گورنر نے اپنے ایک دوست اور ایک بڑے سرکاری ملازم، جان پامر سے یہ کہا کہ یہاں مسلمانوں نے ایک مدرسہ جاری کیا ہے، تم اجنبی کے طور پر وہاں جاؤ اور دیکھو کہ وہاں کس طرح کی تعلیم ہو رہی ہے۔ جان پامر اس ہدایت کی تعمیل میں مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) پہنچا، گھوم پھر کر خود تفصیلی جائزہ لیا اور اس کی رپورٹ گورنر کو پیش کی، اس کے اقتباسات لائق مطالعہ ہیں۔ ایک جگہ کہتا ہے:

''ایک جگہ ایک صاحب میانہ قد، نہایت خوبصورت بیٹھے ہوئے تھے، سامنے بڑی عمر کے طلبہ کی ایک قطار تھی، قریب پہونچ کر سنا تو علم مثلث کی بحث ہو رہی تھی، میرا خیال تھا کہ مجھے اجنبی سمجھ کر، یہ لوگ چونکیں گے مگر کسی نے مطلق توجہ نہ کی، میں قریب جا کر بیٹھ گیا اور استاد کی تقریر سننے لگا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ علم مثلث کے ایسے ایسے عجیب اور مشکل قاعدے بیان ہو رہے تھے، جو میں نے کبھی ڈاکٹر اسپرنگر (۲) سے بھی نہیں سنے تھے۔

یہاں سے اٹھ کر دوسرے دالان میں آ گیا تو دیکھا کہ ایک مولوی صاحب کے سامنے طالب علم معمولی کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے ہیں، یہاں اقلیدس کے چھٹے مقالے کی دوسری شکل کے اختلافات بیان ہو رہے تھے اور مولوی صاحب اس برجستگی سے بیان

(۱) تقریر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مندرجہ روداد دارالعلوم سنہ ۱۲۹۳ھ ص:۱۳۔ نیز روداد مؤتمر الانصار مرادآباد۔ ۱۳۲۹ھ ص:۲۹

(۲) الیوس سپرنجر [ALOIS SPRIN GER] جرمن نژاد فاضل، مستشرق، جو ۱۸۴۴ء سے ۱۸۴۸ء تک دہلی کالج کا پرنسپل بھی رہا، الاصابہ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر، اتقان علامہ سیوطی اور کشاف اصطلاحات الفنون علامہ قاضی محمد اعلیٰ وغیرہ کتابوں کا مطبع اور ان کی اشاعت کا منصوبہ ساز تھا۔

کرر ہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اقلیدس کی روح ان میں آ گئی ہے''
یہ رائے اس شخص کی ہے جو مغربی فنون و معقولات کا پتلا اور ڈاکٹر سپرنجر جیسے ماہرین فن کا تربیت یافتہ تھا۔ اگر ہمارے یہاں یہ روایت اور ان فنون کے ایسے استادوں کا تسلسل باقی رہتا تو منقولات [علومِ اسلامیہ] اور معقولات کے تمام مباحث و مضامین ساتھ ساتھ چلتے اور یوں یہ مدرسے نہ صرف علماء اور مسلمانوں بلکہ پورے دنیا کے ماہرین فن کی تمناؤں کا مرکز اور جامعیت کی ایسی بے نظیر مثال ہوتے کہ تعلیم کی دنیا میں کسی کو ان سے ''من دیگرم تو دیگری'' کہنے کا موقع ہی باقی نہ رہتا۔

یہاں یہ بات بھی معلوم ذہنی چاہئے کہ منقولات کے ساتھ معقولات کی شمولیت اور دونوں کی مشترکہ تعلیم کا یہ نظام اور عقلی موضوعات پر مضامین کی مذکورہ ترتیب اور ان کی قرأت و تعلیم کا یہ سلسلہ، ان مدارس کے اولین بزرگوں کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا تھا، بلکہ ان حضرات کے بعد جن بزرگوں نے اس سفینۂ علم و ہدایت کی پتوار سنبھالی اور کشتی ملت کو منجدھار سے نکال کر ساحل تک لانے کی متواتر جدوجہد فرمائی، وہ اور تمام معاملات واصول کی طرح، اس خیال اور نظریہ میں بھی اپنے بزرگوں کی مقررہ شاہراہ عمل پر قائم اور ان کے قدم بہ قدم تھے۔ ان سب حضرات نے بھی، جو صف اول کے بزرگوں کے بعد ان کے جانشین اور اس قافلۂ علم وعمل سے قائد و سالار تھے، اسی حکمت عملی اور طریقۂ تعلیم کو قائم و باقی رکھا تھا۔

اس مقصد کے لئے کی گئی ایک بڑی پرزور کوشش موتمر الانصار کا قیام تھا، موتمر الانصار کا پہلا بڑا اجلاس عام، ربیع الاول سنہ ۱۳۲۹ھ (اپریل سنہ ۱۹۱۱ء) میں مرادآباد میں منعقد ہوا تھا۔

اس اجلاس میں دارالعلوم کی بنیادی فکر، نظام تعلیم، طریقۂ تعلیم اور مقاصد تعلیم کا بھرپور اعادہ و تذکرہ ہوا تھا اور حضرات اکابر کے طریقۂ تعلیم اور منتخبات و معمولات کو اسی طرح قائم و باقی رکھنے اور اسی قدیم شاہراہ پر مضبوطی سے چلنے کا عزم کیا گیا تھا، جس میں معقولات کی مذکورہ بالا کتابوں سے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی ہدایت وارشادات بطور خاص تازہ کئے گئے تھے اور اسی منہج کو باقی رکھنے کا عہد ہوا تھا۔ جس سے اس کی مکرر تصدیق ہوئی کہ یہ بزرگ معقولات کی تمام شاخوں کو چاہے وہ ابتدائی جزوی معلومات و تدریس پر مشتمل ہوں یا اعلیٰ مباحث و درجات پر، دینی علوم اور نصاب کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وہ پہلو اور عنوان ہے جس کو دنیائے علم کے تمام اکابر و شہسوار دانش مندی سے یاد فرماتے تھے۔

دارالعلوم کے قدیم نصابات میں معقولات کی درج بالا شاخوں کی تعلیم، ان ہی چند کتابوں پر ختم نہیں ہوجاتی تھی، جن کا تذکرہ ہوا، بلکہ جیسا کہ حضرت مولانا نانوتوی کے اس ارشاد سے جھلکتا ہے معقولات کے اورمباحث ومضامین بھی، مدرسہ کے نصاب اور مقاصد سے خارج نہیں تھے۔ بعد کے دور میں اس میں چند شاخوں کا مزید اضافہ کیا گیا تھا، جس میں فلسفۂ جدید (مغربی فلسفہ) بھی شامل تھا۔ جب علامہ رشید رضا مصری اواخر ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۰ھ [۱۵/اپریل سنہ ۱۹۱۲ء] میں دارالعلوم دیوبند آئے تھے، اس وقت ذمہ داروں نے علامہ کو بتایا تھا کہ دارالعلوم میں جدید فلسفہ کی ابتدائی کتاب: "النقش کالحجر" نصاب میں شامل ہے، علامہ رشید رضا نے اس کتاب کے شامل نصاب کئے جانے پر خوشی کا اظہار کیا تھا، مگر اس موضوع پر اور کتابوں کے اضافہ کی بھی رائے دی تھی، جو اس سے زیادہ مفید ہوں۔ علامہ کی تقریر کے اس حصہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

---

(۱) موتمر الانصار کی تشکیل دارالعلوم کے سب سے پہلے فارغین کا ایک منصوبہ یا ارادہ یہ تھا، جس کی ۱۲۹۵ھ میں ان طلبہ کی ذمہ داران مدرسہ کے نام ایک درخواست کی صورت میں ابتداء ہوئی تھی، مگر اس وقت اس کی علیحدہ ترتیب تشکیل نہیں ہوسکی تھی۔ اس واقعہ کے تقریباً تیس سال بعد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کی ہدایت پر، مولانا عبید اللہ سندھی نے رمضان المبارک سنہ ۱۳۲۷ھ (اکتوبر ۱۹۰۹ء) میں یہ تنظیم قائم فرمائی، اس وقت موجود تمام علمائے دیوبند اور فارغین دارالعلوم نے اس پر جوش لبیک کہی اور دلی مسرتوں کا اظہار کیا۔ جب موتمر الانصار کے کام اور مقاصد کی ایک عملی صورت بن گئی، اس وقت اس کا پہلا اجلاس بلایا گیا۔ جو ۱۵/تا ۱۷/ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ ۱۵/۱۷/اپریل سنہ ۱۹۱۱ء کو مرادآباد میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں:

(۱) حضرت مولانا احمد حسن امروہوی　　(۲) مولانا حافظ احمد نانوتوی
(۳) مولانا حبیب الرحمان عثمانی　　(۴) مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی
(۵) حضرت مولانا اشرف علی تھانوی　　(۶) حضرت علامہ انور شاہ کشمیری
(۷) حضرت مولانا حسین احمد مدنی　　(۸) مولانا عبید اللہ سندھی
اور (۹) مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ تعالی

بطور خاص شامل تھے۔

موتمر الانصار کا غالبًا سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ دارالعلوم دیوبند کو اسی قدیم طریقہ پر گامزن رکھا جائے، جو اس کے بانیان گرامی اور ان کے رفقائے کرام نے قائم کیا اور چھوڑا تھا۔ تعلیم کے جن اصول اور طور وطریق میں مدرسہ اس پرانے راستہ سے کچھ دور ہوگیا ہے، اس کو اکابرین مدرسہ کے نظریات اور ہدایات وتعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے اسی راستہ پر لایا جائے، جس سے جدید وقدیم مدرسہ میں کچھ فرق معلوم نہ ہو۔ جب وہی طریقہ اپنائیں گے اور وہی نظام تعلیم زندہ اور نافذ ہوگا تو، امید ہے کہ اس سے پھر ویسے ہی جامع افراد تیار ہوسکیں گے، جیسے پہلے دور میں ہوئے تھے، اور ان سے وہی فائدہ ہوگا جو اس وقت ہوا تھا۔ تفصیلات کے لئے روداد، موتمر الانصار مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند

''ایک جماعت ہم میں ایسی بھی ہونی چاہئے جو ان شبہات کو رفع کرے، جو اسلام پر کئے جاتے ہیں، خصوصاً وہ شبہات جو موجودہ زمانہ کے علوم وفنون کی بنا پر کئے جاتے ہیں مگر ایسے شبہات کا رفع کرنا، فلسفۂ جدید کی واقفیت کے بغیر ناممکن ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے اشخاص فلسفۂ جدید کے اہم مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں۔
مجھے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اس سلسلہ کو شروع کیا ہے اور جدید فلسفہ کی ایک ابتدائی کتاب: ''النقش فی الحجر'' کو درس میں داخل کیا ہے، میرے نزدیک یہ کتاب ناکافی ہے، میں آپ کو ایسی کتابیں بتلاؤں گا جو اس سے زیادہ مفید ہوں گی (۱)

علامہ رشید رضا کی تقریر میں النقش کالحجر کے تذکرہ اور اس تقریر کی دارالعلوم کی روداد میں اشاعت کے بعد اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب: النقش کالحجر دارالعلوم کے نصاب میں شامل تھی مگر روداد سے اس کا تعارف نہیں ملتا، اس کے لئے اس کی کسی قدر تفصیل درج کی جاتی ہے۔

النقش فی الحجر علام طبعیہ کے تعارف اور ابتدائی اصول پر مشتمل ایک درسی کتاب ہے جو چھوٹے چھوٹے آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ ان کے مندرجات ومضامین کی ترتیب یہ ہے:

حصہ اول: مبادی عامہ فی الطبعیات	[طبعیات کے ابتدائی اصول	Elementry Principles of Physics
حصہ ثانی: الکیمیاء	[کیمسٹری	[CHEMISTRY
حصہ ثالث: الطبعیات	[طبعیات	[PHYSICS
حصہ رابع: الجغرافیة الطبعیه	[جغرافیۂ طبعی	[PHYSICAL GEOGRAPAHY
حصہ خامس: الجیولوجیا	[علم طبقات ارض	[GEOLOGY
حصہ سادس: الهیئة	[ہیئت/فلکیات	[ASTRONOMY
حصہ سابع: علم النباتات	[نباتات	[BOTANY
حصہ ثامن: اصول المنطق	[اصول منطق	[PRINCIPLES OF LOGIC

(۱) علامہ رشید رضا کی دیوبند آنے کی مختصر خبر، دارالعلوم دیوبند کی سنہ ۱۳۲۹ھ کی روداد میں درج کی گئی تھی اور مفصل رپورٹ جس میں استقبالیہ، سپاس نامہ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی اصل عربی تقریر اور علامہ رشید رضا کی جوابی تقریر کا اردو ترجمہ شامل ہے، سنہ ۱۳۳۰ھ کی روداد میں درج ہے، تقریر کا عربی متن شریک اشاعت نہیں۔ ملاحظہ ہو: روداد سنہ ۱۳۳۰ھ ص: ۳۵ تا ص ۵۰ (جس میں نو صفحات کا ضمیمہ بھی ہے۔)

یہ کتاب مشہور امریکہ نژاد، مستشرق کرنیلوس فنڈ یک (CORNELIUS YANDYCE۔ پیدائش ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۸ء۔ انتقال: ۱۳۱۳ـ۱۸۹۵ء) کی تالیف ہے، جو عرب ممالک خصوصاً شام اور لبنان وغیرہ میں مغربی اقتدار اور عیسائیت کی اشاعت کا رکن رکین، بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے بانیوں میں سے ایک، امریکن مشنریز کا عرب دنیا میں سب سے بڑا نمائندہ، متعصب پادری اور بائبل کا عربی مترجم بھی تھا۔ فنڈ یک کی ایک اور مشہور کتاب جو ہمارے مدارس کے نصاب میں شامل رہی اور غالباً اب بھی مولوی فاضل وغیرہ کے امتحانات میں ہے محیط الدائرہ ہے، جو عروض وقوافی کے موضوع پر ہے(۱)

اس کتاب کی دارالعلوم کے نصاب میں شمولیت پر غور کیجئے، تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی نگاہ میں، انگریز حکومت، انگریزی ثقافت وتہذیب، انگریزی زبان اوران کے علوم وفنون الگ الگ حیثیت رکھتے تھے۔ انگریز اور انگریزی ثقافت سے اختلاف اوراس کی تردید کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ان کے علوم وفنون اور تعلیم کے بھی ایسے ہی مخالف وناقد تھے، اگر ایسا ہوتا تو ہمارے حضرات خصوصاً حضرت شاہ محمد اسحاق اور اس دور کے اکابر وعلماء اس کی کھل کر مخالفت کرتے، اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے خاص شاگرد، مولانا رشیدالدین کشمیری دہلوی حضرت شاہ محمد اسحاق کے ایماء پر دلی کالج کی صدر مدرسی قبول نہ کرتے، حضرت مولانا مملوک العلی چھبیس سال تک دہلی کالج کے نائب صدر مدرس، پھر صدر مدرس نہ رہتے، اور یہ حقیقت کسی تحقیق کی محتاج نہیں کہ وہ تمام اکابر وعلماء جنہوں نے دارالعلوم ومظاہر علوم اوراس سلسلہ کے دوسرے مدارس قائم کئے تھے وہ سب دہلی کالج کے فیض یافتہ وپروردہ اور کم سے کم اس کے نصاب تعلیم اور طریقۂ کار سے متأثر تھے۔ دہلی کالج سے واقف اصحاب جانتے ہیں کہ اس کالج میں ہراک مذہب کے فاضل اساتذہ کا اجتماع تھا اور تمام علوم وفنون بلا کسی تفریق کے پڑھائے جاتے تھے، اس سب کے باوجود ہمارے اکابر اس کالج کے ہمیشہ مداح اور خود پر اس کے اثرات واحسانات کے معترف رہے، راقم سطور کو معلوم نہیں کہ ان حضرات میں سے کسی نے دہلی کالج کی برائی یا اس کے نظام کی تردید وتنقید فرمائی ہو۔

دہلی کالج کے اثر سے ان حضرات کی نگاہوں میں کس قدر وسعت اور ذہنوں میں کس قدر آفاقیت

(۱) فنڈ یک اور انکش کالجر کے تعارف کے لئے ملاحظہ ہو: اکتفاء القنوع بماھو مطبوع. تالیف اڈورڈ فنڈ یک۔ ص: ۴۰۱/۴۰۳ (مطبع الہلال، مصر: ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۶)

نیز الاعلام زرکلی ص: ۲۲۳ ج: ۵ (طبعۃ رابعہ، بیروت ۱۹۷۹ء)

گئی تھی اور وہ مغربی افکار ونظریات سے کس درجہ واقف رہنا چاہتے تھے اور رہتے تھے، اس کی متعدد مثالیں قریب کے دور تک موجود تھیں، یہاں حضرت مولانا مملوک العلی کے حوالہ سے صرف ایک اقتباس پڑھ لیجئے۔ دہلی کالج کے ایک مشہور طالب علم (مولوی) کریم الدین پانی پتی نے، اپنے استاد، مولانا مملوک العلی کے متعلق لکھا ہے:

> ''اور جس فن [یعنی مغرب کے ماہرین] کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے، اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہوجاتا ہے، گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے''(۱)

النقش الحجر جیسی کتابوں کی دارالعلوم کے نصاب میں شمولیت وپذیرائی، اسی قدیم روایت کا ایک حصہ تھی۔ یہ اس وقت ہورہا تھا جب دارالعلوم کی مسند حدیث حضرت شیخ الہند کی ذات گرامی سے باوقعت وعظمت تھی، تعلیمی نظام پر شیخ الہند کے نظریات کے اثرات واضح تھے، اس وقت دارالعلوم میں ایسی کتاب کا پڑھایا جانا جو مغربی نظام تعلیم کی نمائندہ اور مغربی اصول وفلسفہ کی ترجمان تھی ایک بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کررہی ہے، حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند برصغیر ہند میں مغربی استعمار اور انگریزیت کے شدید ترین مخالف تھے لیکن یہ حضرات تمام معاملات میں توازن واعتدال اور مناسب درجہ بندی کے قائل تھے، اور فرق مراتب کے ساتھ صحیح وغلط میں امتیاز فرماتے تھے، اس لئے انگریز کی سیاست سے نفرت اور اس کا ہر اک سطح پر مقابلہ اپنی جگہ اور اس کے علوم وفنون سے استفادہ اپنی جگہ! افسوس کہ اب یہ فکر اور وصف ہمارے یہاں سے تقریباً معدوم ہوگیا ہے۔

نیز علامہ رشید رضا نے اپنی تقریر میں النقش الحجر کے تذکرہ کے علاوہ اس اہم پہلو پر بھی توجہ دلائی تھی کہ ایسے شبہات کے اعتراضات کے جوابات کے لئے، جو ان علوم وفنون کی بناء پر کئے جاتے ہیں جو مغرب سے آرہے ہیں، فلسفہ جدید سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔

علامہ رشید رضا کا یہ مشورہ، جو وقت کی ایک اہم ضرورت کے احساس اور گہرے مطالعہ وتجربہ پر مبنی تھا دیوبند کے لئے نیا نہیں تھا، یہ حضرات اس ضرورت سے اس سے بہت پہلے سے واقف تھے اور اس کے لئے ایک حد تک مناسب تدبیریں بھی فرمارہے تھے اس کی بھی ایک مثال ملاحظہ ہو:

(۱) طبقات الشعرائے ہند۔ کریم الدین پانی پتی ص: ۳۶۳ (عکس طبع اول ۱۸۴۷ء لکھنؤ ۱۹۸۳ء)

اس دور میں دین وشریعت اورعقائدواحکام اسلامیہ پر، مغربی تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً عیسائیوں کی طرف سے جواعتراضات کئے جاتے تھے، شام کے ایک بڑے عالم اورفلسفۂ اسلام ومغرب کے فاضل، شیخ حسین مصطفیٰ جسر نے، ان اعتراضات کے مغربی نظریات وفلسفہ کی روشنی میں، عمدہ اسلوب میں بہت فاضلانہ جوابات لکھے تھے، جس میں اسلامی احکامات کی افادیت اور حکمت ومعنویت کواس طرح واضح کیا گیا تھا کہ عالم اسلام میں اس کتاب کی دھوم مچ گئی تھی۔ اس کتاب کا پورانام:

الرسالة الحميديه في حقيقة الديانة الاسلاميه وحقية الشرع المحمديه

ہے، رسالہ حمیدیہ کے نام سے مشہور ہوئی اور ہندوستان بھی پہونچی، یہاں ہر طبقہ کے بڑے علماء اور اہل نظر نے اس کی خوب پذیرائی کی اور یہ کتاب متعدد مدارس اسلامیہ خصوصاً دارالعلوم کے اعلیٰ نصاب میں شامل کی گئی۔

اس کتاب کے عمدہ اسلوب تحریر اور نافعیت کی وجہ سے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے ایک ممتاز شاگرد اور جید عالم، مولانا محمد اسحاق بردوانی کانپوری سے اس کا اردو ترجمہ کرایا تھا، جو ''اسلام اور سائنس'' کے نام سے حضرت مولانا تھانوی کی توجہ اور اہتمام سے شائع ہوا تھا اور اپنے موضوع پر حد درجہ مفید کتابوں میں شمار کیا گیا۔ حضرت مولانا تھانوی نے اس ترجمہ کو حرفاً حرفاً دیکھا اور درست کیا تھا اور اس پر تقریظ لکھی تھی، جس میں تحریر ہے کہ:

> ''مدت سے یوں دل چاہتا تھا کہ کوئی ایسی کتاب جمع کی جاوے جس سے ان خیالات کی اصلاح ہو، جو بوجہ ناواقفیت علوم دینیہ کے بعض نو جوانوں کو تعلیم فلسفۂ جدیدہ سے اسلامی فروع واصول میں پیدا ہو گئے، اسی اثناء میں ایک کتاب حمیدیہ نام نظر سے گزری، جواس غرض کی تکمیل کے لئے کافی ووافی ثابت ہوئی''

(۱) شیخ حسین بن محمد بن مصطفیٰ الجسر۔ طرابلس شام کے رہنے والے تھے سنہ ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵ء میں ولادت ہوئی، اپنے علاقہ کے اپنے دور کے ممتاز اصحاب علم وفضل میں تھے۔ سنہ ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں طرابلس میں وفات ہوئی۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے جس میں رسالہ حمیدیہ بہت مشہور اور مفید ترین تالیف ہے۔ مزید معلومات کے لئے دیکھئے: الاعلام، خیرالدین زرکلی۔ ص:۲۵۸ ج:۲۔ (بیروت: ۱۹۷۹ء)

(۲) رسالہ حمیدیہ، سلطان عبدالحمید خاں امیرالمؤمنین، والی ترکی سے منسوب ہے، پہلی مرتبہ سنہ ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۷۔۸۹) میں شائع ہوا تھا، اس طباعت کا ایڈورڈ فنڈیک نے اکتفاء القنوع بما هو مطبوع (طبع اول ۱۳۱۳ھ۔ ۱۸۹۶ء) میں ذکر کیا ہے ص: ۵۱۴۔ رسالہ حمیدیہ کی پہلی طباعت، مطبوعہ مجلس معارف، بیروت کا ایک عمدہ نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

اس تحریر کے آخر میں فرماتے ہیں:

"اب خدا تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ یہ ترجمہ چھپ جاوے اور ہر طالب علم عربی وانگریزی مدارس کا اس سے منتفع ہو اور ان سب کے لئے یہ سرمایہ ہدایت وابتداء ہو۔ آمین۔"

درج بالا تفصیلات سے واضح ہے کہ قدیم مدارس اسلامیہ خصوصاً دار العلوم اور مظاہر میں ان کے آغاز کے وقت سے ہی، قدیم صالح کے ساتھ جدید نافع کا امتزاج تقریباً پچاس سال تک نہ صرف جاری رہا، بلکہ ہر دور میں اس میں نئے اور مفید اضافے بھی ہوتے رہے۔ یہ روایت غالباً سنہ ۱۳۳۳/۱۹۱۴ء سے کمزور ہوتی شروع ہوئی، جب خلافت اسلامیہ پر انگریزوں کی یلغار کے سبب، مغربی افکار وعلوم سے نفرت کا سبق دیا گیا اور ان کو نصاب سے نکال دینے کی تجویزیں سامنے آئیں، افسوس کہ ان تجویزوں پر عمل بھی ہوا۔ اسی کا اثر تھا کہ مدارس اسلامیہ کے نصاب اور معمول میں منطق وفلسفہ کی طویل طویل (غیر ضروری) کتابوں کے اضافہ کی حوصلہ افزائی کی گئی لیکن معقولات کی دوسری شاخیں، علوم اور مفید مباحث نصاب درس سے غائب اور مفقود ہوتے چلے گئے، یہاں تک یہ کیفیت ہوئی اور وہ وقت آیا کہ ان موضوعات اور کتابوں کی تعلیم وتدریس مدارس عالیہ کے مقاصد بلکہ بعض حلقوں میں دین کے بھی خلاف سمجھ لی گئی، جو ظاہر ہے کہ اسلام کی بارہ سو سالہ علمی تعلیمی روایات اسلاف کے اسوہ اور تمتع زہر گوشہ یافتم کے نظریہ کے خلاف ہے۔

منطق وفلسفہ کے علاوہ اور عقلی موضوعات کو مدارس کے تعلیم نصاب خارج کرنے کا عمل، غالباً سنہ ۱۳۳۳ھ کے قریب شروع ہو گیا تھا، اختتام کی تاریخ مجھے معلوم نہیں مگر مظاہر علوم میں ان میں سے بعض علوم

(۱) مولانا محمد اسحاق بن لطف الہدی، بردوانی، بنگالی۔ سنہ ۱۲۸۳ھ میں ولادت ہوئی، اپنے علاقہ کے علماء سے اور آرا بہار میں ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر کان پور آئے یہاں مولانا اشرف علی تھانوی سے درسیات مکمل کیں۔ تعلیم سے تکمیل کے بعد مدرسہ جامعہ العلوم کانپور میں مدرس ہوئے۔ لمبے عرصہ تک وہاں پڑھایا، پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں استاد مقرر کئے گئے، پھر ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر نامزد ہوئے۔ کئی کتابوں کے مصنف ومترجم تھے، سنہ ۱۳۵۷ھ میں کلکتہ میں وفات ہوئی، وطن میں دفن کئے گئے۔ نزہۃ الخواطر ص ۵۳۔۵۱ ج:۸۔

(۲) سائنس اور اسلام، ذی قعدہ ۱۳۱۷ھ مارچ ۱۹۰۰ء میں امیر احمد تھانوی کے اہتمام سے مطبع روزانہ اخبار، دہلی سے پہلی مرتبہ چھپی تھی۔ یہ اشاعت بڑے سائز کے دو سو پچانوے صفحات پر مشتمل ہے [اس طباعت کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے]

(۳) سائنس اور اسلام ص:۲۹۶ تقریظ مکتوبہ ۱۸ ررجب ۱۳۱۶ھ

وفنون، جزوی انفرادی طور پر سنہ ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء تک پڑھائے گئے تھے، اس کے بعد وہاں بھی ان کا چراغ گل ہوگیا۔ سدانام رہے اللہ کا!

ان معلومات وتفصیلات کی روشنی میں غور فرمایئے کہ کیا اس طریقہ پر عمل اوراس کی صحیح ترتیب وتکمیل کو اپنے بزرگوں کی صحیح پیروی اور نمائندگی قرار دیا جائے گا، جس کا انہوں نے ان مدارس کے آغاز کے وقت ارادہ واعلان فرمایا تھا اور جس پر خود حضرات اکابر بلکہ ان کے بعد کی دوتین نسلیں پچاس سال تک عامل وکاربند رہیں، یا ان ترمیمات واصول کو، جوان قافلہ سالارانِ علم وصلاح کی دنیا سے رخصت کے برسوں کے بعد روبہ عمل آئے؟ سلف کی تقلید واتباع اس کو قرار دیا جائے گا یا اس کو، دینی علمی نفع اس میں زیادہ تھا یا اس میں؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا......؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقلی علوم وموضوعات کی دینی اداروں سے خانہ بدری کے عمل اور اس تغیر وانقلاب میں، دومحرکات خاص طور سے دخیل وکارفرما ہے:

ان تمام بزرگوں کی وفات جنہوں نے یہ مدارس قائم کئے تھے۔ یہ حضرات وہ تھے جنہوں نے سنہ ۱۸۵۷ء میں دہلی میں قلعہ معلی کی حکمرانی اور مغل حکومت کی آخری ٹمٹماتی جھلک دیکھی تھی، پھر سنہ ۱۸۵۷ء کے خوں آشام ہولناک انقلاب کا بھی نظارہ کیا اوراس کے نتیجہ میں برصغیر کے مسلمان جس طرح بے حیثیت اور گردکارواں بن کررہ گئے تھے، اس کا بھی بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا، اور حکومت برطانیہ کے استحکام سے، یہاں کے نظام تعلیم ومعاشرت پر جواثرات پڑ رہے تھے، اس کا بھی یہ حضرات پوری بصیرت اوردانائی کے ساتھ مطالعہ کررہے تھے۔ اسی تأسف اورنقصان کے غیر معمولی ادراک واحساس نے ان حضرات کو یہ مدارس قائم کرنے پر آمادہ کیا تھا، ان حضرات کی بلند نگاہوں اورعالی فکر نے اس کا احساس فرمالیا تھا کہ اب اس امتزاج کی، جس کا ہم نے حضرت مولانا مملوک العلی کے حلقۂ تلمذ اوردہلی کالج کے زمانہ تعلیم میں تجربہ اوراستفادہ کیا تھا، پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ اس لئے ان حضرات نے علوم دینیہ کی خدمت اوراحیائے اشاعت اسلام کو اصل اصول اور مینارۂ نور قرار دیتے ہوئے، اپنے مدرسوں کے لئے جونصاب تعلیم تجویز فرمایا تھا اس میں

(۱) دہلی کالج اور مولانا مملوک العلی نانوتوی کے فیض یافتہ اصحاب میں سے، ان مدارس میں آخری بڑے عالم، شیخ الہند کے والد ماجد، مولانا ذوالفقار علی......وفات ۱۵ ارجب ۱۳۲۲ھ (ستمبر ۱۹۰۴ء) تھے۔

ایسے عقلی علوم کی آمیزش اور چاشنی بھی شامل فرمائی تھی، جن کو آج کل مغربی علوم کہا جاتا ہے۔ ان بزرگوں سے بہتر اس کا اندازہ کس کو ہوسکتا تھا کہ یہ علوم جو ذہن کی جلاء، وقت کے تقاضوں کی تکمیل اور ان کی تفہیم و تحقیق کے لئے بے حد ضروری ہیں۔

ممکن تھا کہ جدید علوم سے استفادہ اور ان کے دائرۂ علم کی مدارس میں شمولیت کا عمل، علامہ رشید رضا کے سفر ہند اور مشوروں کے بعد آگے بڑھتا اور اس میں کچھ نئے موضوعات و مضامین شامل ہوتے کہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۷) شروع ہوگئی، جس میں خلافت اسلامیہ (ترکی) جرمنی کے علاوہ، تمام مغربی ملکوں کی یلغار کا نشانہ بنی۔ اس جنگ کے مقاصد اور لمبے سازشی منصوبوں کے سامنے آنے کے بعد مغربی ملکوں کا خلافت ترکی کے خلاف خصوصاً اور تمام مسلم ملکوں کے خلاف عموماً جو خونخوار چہرہ سامنے آیا اور ان ملکوں خصوصاً برطانیہ کے ہاتھوں مسلمانوں کی حرمت و آبرو جس طرح پامال ہوئی، اس سے پوری مسلم دنیا میں انگریزوں کے خلاف شورش بھڑکنا اور آگ سی لگ جانا بالکل فطری بات تھی۔ برصغیر ہند کے مسلمان بھی جو عالم اسلام کے نظام کا ایک بڑا حصہ ہیں، بجا طور پر اس سے بے حد متاثر ہوئے اور یہاں بھی انگریزی استعمار اور مغرب کے ظلم و ستم اور سیاسی جنگی منصوبوں کے خلاف بلند اور طاقتور آوازیں اٹھنی شروع ہوگئیں، جنہوں نے جلد ہی ملک گیر تحریکات کی صورت اختیار کرلی تھی۔ تحریک خلافت، ریشمی رومال تحریک، تحریک ہجرت، تحریک خدام کعبہ وغیرہ تنظیمیں اور تحریکات اسی کا ردعمل اور اسی جدوجہد کا ایک حصہ تھیں، انہی تحریکوں کے اثر سے مسلمانوں نے کانگریس پارٹی کے ساتھ تعاون کا ہاتھ بڑھایا جہاں سے بات بڑھتے بڑھتے انگریز کے خلاف عدم تعاون (Non'Co' Operation) تک پہنچی، مختلف تحریکات کے ایک حصہ یا احتجاج کے طور پر انگریزوں کے خلاف اور بھی کئی پہلوؤں سے اظہار ملامت و نفرت کیا گیا تھا، اسی میں ایک [ناپسندیدہ] عنصر یہ بھی شامل ہوگیا کہ یہ نفرت انگریز کے سیاسی نظام اور استعمار کے سیاسی نظام تک محدود نہ رہ کر، ان سب چیزوں اور مباحث و موضوعات و ایجادات و مستعملات تک پہنچ گئی تھی جن کا مغرب خصوصاً برطانیہ کے تعلیمی اداروں، علوم و فنون اور کارخانوں سے کسی طرح کا بھی کچھ تعلق تھا یا جس کی وہاں تعلیم تحقیق اور تشکیل ہورہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس ملک گیر وسیع اور ردعمل سے برصغیر کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ بے حد متاثر ہوا، اور اس نے سیاسی تحریک میں شدت لانے کے لئے یا فرط جذبات میں، ایسے موضوعات و مضامین کو بھی جو اگرچہ پرانے زمانہ سے

مدارس کے نصاب میں بھی شامل تھے۔ لیکن کالجوں یونیورسٹیوں میں بھی اہتمام سے پڑھائے جاتے تھے، اسی انگریزی نظام وسیاست کا ایک حصہ سمجھ لیا، اور ان سب کو انگریز دشمنی میں ایک ایک کر کے، دینی نظام تعلیم یا مدارس سے خارج کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا، بالآخر وہ وقت آیا کہ ان سب ہی کی تعلیم فضول اور ناپسندیدہ قرار پائی۔ یوں ہم ان تمام علوم وفنون، مباحث وموضوعات سے محروم ہو گئے جن کو موجودہ بلند مقام تک پہنچانے میں امت کے بے شمار اعلیٰ دماغ اور بارہ سو سال کی محنت صرف ہوئی تھی، حالاں کہ ان علوم اور مغربی سیاسی نظام کا کوئی باہمی رشتہ نہ تھا، یہ تو ایک تحقیق ایک تجربہ اور جدوجہد ہے، جو اس میں لگے گا دنیاوی ترقیات کی منزلیں طے کرے گا، ایجادات ومعاش میں آگے بڑھے گا اور نظام عالم پر اپنی گرفت مضبوط کرے گا۔

یہ ایک سانحہ اور المیہ ہی ہے کہ وہ تمام علوم وفنون، جن کو اب ہم نے اپنے دینی ملی ورثہ سے خارج کر کے مغرب کے سرمایہ علم کا حصہ سمجھ لیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے عہد تک، نہ صرف عالم اسلام بلکہ برصغیر ہند میں بھی، اکثر مدارس کے نصابات اور تعلیمی نظام کا ایک خاص جز شمار کئے جاتے تھے۔ تاریخ کے اوراق کی معمولی ورق گردانی کرنے والے بھی جانتے ہیں کہ یہ تمام علوم ومباحث جن کو ہم پتہ نہیں کیوں مغربی علوم کہتے ہیں، ہمارے مدارس، خانقاہوں بلکہ مساجد تک میں پڑھائے جاتے تھے۔ علمائے کرام انفرادی اجتماعی طور پر ان کا درس دیتے اور اپنے شاگردوں کو ان میں ایسا ماہر ومشاق بنا دیتے تھے کہ کئی مرتبہ مغربی ماہرین کو بھی ان کی لیاقت وصلاحیت پر رشک آتا تھا اور وہ بھی ان کو اپنے طرۂ کمال میں ٹانکنے کے لئے تیار بلکہ بے تاب وبے قرار ہو جاتے تھے۔

اور یہ بھی ایک دردناک تاریخی حقیقت ہے کہ درج بالا عقلی علوم وفنون میں سے کئی ایسے ہیں کہ جب ان کو ہمارے مدارس نے اپنے حلقۂ درس سے خارج کر دیا، تو ان کی افادیت کی وجہ سے، کالجوں نے اپنے نصاب میں ان کا زیادہ اہتمام شروع کر دیا، جس کے اثر سے دنیا کے ظاہری مفادات کی ترازو میں ہمارا وزن کم اور ہلکا ہوتا اور ان کا اسی تناسب سے بڑھتا چلا گیا۔

اور یہ بھی ایک عالم آشکارا حقیقت ہے کہ ہمارے مشرقی حلقوں اور اداروں میں، جن علوم ومباحث کو مغرب کا خاص تحفہ اور میراث سمجھا جاتا ہے کہ ان کی پرورش اور تزئین وآرائش، مسلم ملکوں اور قدیم اسلامی مشرقی درس گاہوں میں ہوئی تھی مغربی افراد اور تعلیمی اداروں نے اپنے اکثر علوم اور نظریات ان ہی مسلم

ملکوں، علماء اور اداروں سے حاصل کئے تھے پھر ان کو ترقی دی آگے بڑھایا اور ان میں مسلسل محنت کر کے ان کو اپنا اختصاص اور سرمایۂ ناز بنالیا۔ جب ہم نے ان سے اپنا دامن جھٹک لیا تو ان لوگوں نے ان پر محنت اور ان کی سرپرستی کی جو نظام عالم پر اپنی برتری چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے ان علوم کو درجہ کمال تک پہنچا کر آسمان میں کمندیں ڈال دیں، ایک ہم ہیں کہ:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

امید کہ ان معروضات کی روشنی میں اکابر کے طریقہ کے مطابق قدیم خالص اور جدید نافع کے امتزاج کو عمل میں لانے کی کوششیں پھر تازہ ہوں گی اور

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد